یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۳۷

اس شمارے میں

آل احمد سرور

میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

(۱۳)

امریکہ کے لوگ خاصے انفرادیت پسند ہیں، نوجوانوں کو سکھایا جاتا ہے کہ اپنی صلاحیت کو پہچانو، اس پر اعتماد کرو اور اس کے لئے تکلیف اٹھانے کو تیار رہو، دنیا جہان کے شکست خوردہ ملکوں (LOST CAUSES) کے علمبردار آپ کو امریکہ میں مل جائیں گے۔ یونی ورسٹیوں میں استادوں کو اکثر ایسے طالب علموں سے سابقہ پڑتا ہے جو اچھے خاصے پڑھتے پڑھتے، ٹرم پیپر لکھتے لکھتے، استاد سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے کرتے اچانک کہتے ہیں کہ انھیں اس موضوع سے دلچسپی نہیں رہی اس لئے اب اسے چھوڑ رہے ہیں اور اس پر نہ استاد برہم ہوتا ہے اور نہ والدین۔ دونوں نوجوان کو اپنے شوق کو پورا کرنے، اپنی جنّت یا دوزخ بنانے، اپنی منزل دریافت کرنے، اپنے آپ کو پہچاننے کی اہمیت سمجھتے ہیں۔ اس انفرادیت پرستی کے باوجود امریکہ کے نوجوانوں اور بوڑھوں میں میں نے خاصی سماجی لگن دیکھی۔ ایک صاحب سے گفتگو میں ملاقات ہوئی۔ یہ فارمن کرسچین کالج لاہور میں برسوں تک پڑھاتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی بیوی ایک پادری کی بیٹی تھیں۔ آسیٹے میں پیدا ہوئیں، اردو اچھی خاصی جانتی ہیں۔ میاں کی عمر پچاسی سال کی ہوگی، بیوی کی اسّی کے لگ بھگ۔ دونوں اپنے علاقے کے سماجی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ بیوی غریب گھرانوں کے لئے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتی تھیں۔ میاں اپنے علاقے میں فضا کی گندگی کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ انتخابات میں ایسے امیدواروں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے جو کالوں اور گوروں میں تفریق کے خلاف ہوں اور ان کے لئے کام بھی کرتے تھے۔ ایسے شہریوں کی کمیٹیوں کا روزنامچہ سننے میں آتا تھا جو نہ صرف اپنے علاقے کے تمام مسائل پر بحث کرتے تھے بلکہ غیر ملکیوں کے لئے مختلف طرح کے کورس چلاتے تھے۔ کسی کو انگریزی بولنا سکھایا جا رہا ہے، کسی کو سلائی کی تعلیم دی جا رہی ہے، کہیں دنیا کے کسی ملک میں آفت زدہ اور ستم رسیدہ اشخاص کے لئے مالی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ اس امریکن جوڑے سے میں بہت متاثر ہوا۔ بچے بڑے تھے اور الگ رہتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار ملنے آجاتے تھے، بچوں کے اور ماں باپ کے خیالات میں خاصا فرق تھا مگر دونوں میں میں نے رواداری پائی۔ جو لوگ ہندوستان ہو آئے ہیں ان کے گھروں میں ہندوستان کے نوادر ضرور ملیں گے۔ وہ ان ہندوستانیوں سے جن سے ملنا جلنا ہوا ہے، خط و کتابت ضرور کریں گے۔ عام طور پر ہندوستان کے لئے ان میں ہمدردی کا جذبہ نمایاں ہوگا۔ وہ ہندوستان کی کسی خاص کا

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

ذکر بھی کریں گے تو طنز کے لہجے میں نہیں افسوس کے لہجے میں۔ یونی ورسٹی کے لوگ اپنے مضمون کے علاوہ کوئی ایک دلچسپی (HOBBY) بھی رکھتے ہیں، خواہ وہ سکّے جمع کرنا ہو یا پتھر جمع کرنا یا پرانے گیت یا مخطوطات یا کسی سلسلے میں معلومات۔ عام آدمیوں میں تو امریکہ کی صنعتی ترقی اور وہاں کے سیاسی نظام، سائنس اور ٹیکنالوجی کے کمالات اور شہری زندگی کی آسائشوں پر فخر ملے گا، مگر دانشوروں اور معلّموں اور نوجوانوں میں دوسروں کے خیالات جاننے، تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے اور سچ کے ان گنت روپ ماننے کا جذبہ بھی نظر آئے گا۔ یہ لوگ ہر تجربہ کرنے کو تیار ہیں، ہر رنگ کو ایک دفعہ آزمانے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں آزادیٔ فکر کی بنیادی اہمیت ہے۔ طالب علم بے دھڑک پروفیسر سے اختلاف کرتا ہے۔ پروفیسر خندہ پیشانی سے جواب دیتا ہے۔ میں نے امریکہ جانے سے پہلے کئی اخباروں اور رسالوں میں پڑھا تھا کہ وہاں کمیونزم سے بڑی نفرت ملتی ہے اور ایک طرح کا خوف بھی اس نفرت کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ یہ بات بڑے سرمایہ داروں اور برسرِ اقتدار طبقے کے متعلق صحیح ہے، مگر امریکہ کی یونی ورسٹیوں میں استادوں اور طالب علموں کے یہاں مجھے کمیونزم، روس اور چین سے خاصی دلچسپی ملی اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی خاصی ہے جو بائیں بازو کے خیالات رکھتے ہیں۔ روس اور چین کے متعلق تحقیق کرنے والوں اور ان ملکوں کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا علم رکھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ امریکہ والے ایک زمانے میں اپنی دنیا میں مگن تھے۔ دوسروں کی انھیں پروا نہ تھی، مگر اب یہ بات نہیں ہے۔ ویسے علحدگی پسند سیاسی حلقے اب بھی ہیں، مگر روز بروز ان کا زور کم ہوتا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس امریکہ میں کچھ روز پہلے میکارتھی کے اثر سے سوشلزم اور کمیونزم کا نام لینا بھی جرم تھا اور بہت سے لبرل حضرات کو بے تکلف کمیونسٹ کہہ دیا جاتا تھا۔ مارکسزم ایک فلسفے کی حیثیت سے امریکہ میں غور سے پڑھا جاتا ہے۔ بعض مارکسی نقادوں مثلاً ہنگری کے (LUCAKS) کی اہمیت کو مانا جاتا ہے۔ بریخت (BRECHT) کو بیسویں صدی کے عظیم ڈراما نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی پر حال میں جو کتابیں نکلی ہیں ان میں ایرک ایرکسن (ERIC ERICSON) کی گاندھی کا سچ (GANDHIS TRUTH) بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں مصنف نے گاندھی جی کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں گہری ہمدردی کے ساتھ، بعض باتوں میں اختلاف بھی کیا ہے۔ ایڈورڈ شلس (EDWORD SHILS) نے ہندوستانی نوجوانوں کی نفسیات اور ہندوستانی دانشوروں کی ذہنی کیفیت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کہنے کا مقصود یہ ہے کہ امریکہ ذہنی طور پر اپنے خول سے باہر نکل رہا ہے اور حریتِ فکر اور ایک سماجی شعور کے سہارے، ایک ایسے انقلاب کے لئے تیاری کر رہا ہے جس میں فرد کی آزادی اور ایک بہتر سماج کی تعمیر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

(باقی)

فراقؔ صاحب بیمار ہو گئے

الہ آباد۔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری بیمار ہو گئے ہیں اور الہ آباد میڈیکل کالج میں علاج کے لئے داخل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ فراقؔ صاحب کو "پیری کی پیچیدگیاں" لاحق ہیں۔

• قومی آواز

روس میں اردو قواعد کی اشاعت

ماسکو: ناؤکا اشاعت گھر نے اردو قواعد کی ایک کتاب شائع کی ہے یہ کتاب سوویت مستشرقین میں بروڈسکو والا اور لیدیا برکشش نے مرتب کی ہے پراودا نے اس کتاب کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سوویت یونین کے عوام مشرق کی قوموں کی تہذیب اور ان کی زبانوں کے مطالعہ سے گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔

• الجمعیۃ

بیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب

پروفیسر جاوید نہال کی معروف تصنیف "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" کا دوسرا حصہ بعنوان "بیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" عنقریب منظرِ عام پر آرہا ہے۔ جو ایک موثر اور پر مغز تحقیقی کتاب ہوگی۔

پتہ: ایم۔ اے۔ نقر
M. NO. ۸۷۶
اردو رائٹرس ایسوسی ایشن کلکتہ

•

یاد رکھئے کہ مردم شماری زبان کا صحیح اندراج کے لئے ہی نہیں بلکہ آئندہ سارے قومی منصوبوں کے لئے ضروری ہے اس کی اہمیت کو پہچانیے۔

مرزا سعید الظفر چغتائی

فرانسیسی زبان

یورپ میں بولی جانے والی سبھی زبانوں پر لاطینی کے اثرات ہیں۔ اس لئے کہ رومی شہنشاہیت پہلی صدی قبل مسیح میں جنوبی، وسطی، مغربی یورپ اور شمالی افریقہ پر چھاگئی تھی اور صدیوں تک چھائی رہی۔ پھر عیسائیت کا دور آیا، تو پاپائے روم نے لاطینی کو کلیسا کی سرکاری زبان قرار دیا۔ انجیل مقدس کا قدیم ترین معلوم نسخہ قدیم یونانی میں ہے۔ مگر سرکاری حیثیت اس نسخے کے لاطینی ترجمے کو حاصل ہوئی۔ یورپی اور غیر یورپی زبانوں میں انجیل کے تقریباً سارے ترجمے اسی لاطینی نسخے سے کئے گئے اور مشرقی یورپ کے آرتھوڈکس ORTHODOX عیسائیوں کو چھوڑ کر لوتھر کی اصلاح مذہب کی پروٹسٹنٹ تحریک سے پہلے پورا یورپ اسکینڈی نیویا تک کیتھولک ہو چکا تھا۔ آج بھی جنوبی اور مشرقی یورپ میں اٹلی، اسپین، پرتگال، فرانس، یوگوسلاویا اور رومانیہ کے کم از کم اسّی یا نوّے فی صد باشندے اسی عیسائی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مغربی یورپ کے سبھی قدیم تعلیمی ادارے کلیسا یا عیسائی خانقاہوں کی زیر سرپرستی قائم ہوئے۔ یہ خانقاہیں پوری طرح پاپائے روم کے زیر نگرانی تھیں۔ یہ صورت حال سترھویں اٹھارھویں صدی تک قائم رہی۔ اس لئے یورپ کی علمی اور ذہنی زندگی پر عیسائی تصورات کے ساتھ ساتھ لاطینی زبان پوری طرح چھاگئی۔ سترھویں صدی تک اہم علمی کتابیں لاطینی میں لکھی جاتی رہیں، مثلاً نیوٹن کی PRINCIPIA اور OPTIK، فرانسس بیکن کی NOVUM ORGANUM، اسپنوزا کی ETHICA وغیرہ۔ مزید برآں بین الاقوامی فیصلے کے مطابق نباتات BOTANY کی جملہ اصطلاحیں لاطینی ہونا قرار پائیں۔

لاطینی کی قوت اشتقاق بے پناہ ہے۔ یونانی اور بعد میں عربی اثرات اور ذخیرۂ الفاظ نے بھی لاطینی کو بڑا فیض پہنچایا اور خوب مالا مال کیا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ لاطینی خاندان کی سبھی زبانوں میں حرف اختصاص DEFINITE ARTICLE ہی کو کسی نہ کسی طرح استعمال کرنے سے بنتا ہے۔ شاید اسکینڈی نیویائی زبانوں کا براہ راست تعلق دوسری، تیسری صدی عیسوی میں یونانی سے رہا ہو، ورنہ سبھی مغربی، وسطی اور شمالی یورپ کی زبانوں میں یونانی الفاظ لاطینی ہی کے توسط سے آئے ہیں۔ یہ الفاظ خود لاطینی میں بہ کثرت ہیں، لیکن ان کی ساخت اور تلفظ لاطینی لہجے اور مزاج کے مطابق ڈھل گئے ہیں۔

آج کل بولی جانے والی یورپی زبانوں میں اطالوی، ہسپانوی کستلان، پرتگالی اور فرانسیسی لاطینی خاندان میں آتی ہیں۔ مقامی اثرات ہر زبان اور لہجے میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ پانچوں زبانیں اپنا اپنا امتیازی وصف رکھتی ہیں۔

فرانس اپنے محل وقوع کی بنا پر گزرگاہ خلائق رہا ہے اور ہے۔ نزدیک و دور کے باشندے یہاں آکے بستے اور اپنی زبان و تہذیب باہم سموتے رہے۔ اس لئے فرانسیسی ایک نسل نہیں ایک قوم یا ملت ہیں اور ان کی زبان و تہذیب مخلوط و مرکب ہے۔ فرانسیسی زبان میں شدید اختلاط نے اس کی روانی، سلاست اور شیرینی اُگلی ہے۔

مرزا خلیق

غزل

نہ جانے سوچ میں کیوں پڑ گیا ہوں
کبھی اس شخص سے جب میں ملا ہوں

میں ہوں تو لفظ لیکن بے صدا ہوں
زبان کے لمس کو ترسا کیا ہوں

بکھر جاؤں جہاں بھی تو بکھیرے
لہو کی گرد ہوں بے دست و پا ہوں

کبھی میں جسم ہوں سایہ کبھی ہوں
مکاں سے لامکاں تک سلسلہ ہوں

طلب ہے روح کو کس شے کی یارو
میں کس کی جستجو میں پھر رہا ہوں

رومی شہنشاہ سیزر نے سن ۵۰ ق۔ م میں پیرس کا محاصرہ کیا تھا۔ تب سے تقریباً ۵۰۰ برس تک یورپ کے سواد اعظم میں شامل ہو کے فرانس رومی تہذیب سے فیض یاب ہوتا رہا۔ اس وقت کے فرانس میں غالب نسل، گول، کلتی اور اس کے افراد نے رومیوں کے ساتھ مل کے موجودہ فرانس کی زبان و تہذیب کی بنیاد رکھی۔ فرانسیسی زبان میں جو آداب [illegible] ([illegible]) وہ انھیں گروہوں کی دین ہیں۔ انھیں لوگوں نے لاطینی الفاظ کو مقامی بولی میں بہ کثرت استعمال کیا اور اپنے لب و لہجے میں ڈھالا۔

سن ۱۰۶۶ء میں موجودہ فرانس کے شمالی مغربی صوبے نورمانڈی NORMANDIE کے ڈیوک، فاتح گیوم GUILLAUME نے

ہسٹنگ کی لڑائی جیت کے انگلستان پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت تک انگلستان میں رائج اینگلو سیکسن ANGLO SAXON لہجے مختلف جرمن بولیوں سے متاثر ہو چکے تھے۔ نارمن قوم کے لائے ہوئے جنوبی یورپ کے ان لاطینی اثرات ہی نے مستقل انگریزی زبان کی داغ بیل ڈالی۔ انگریزی میں لاطینی الفاظ کی جو بڑی تعداد ملتی ہے، ان میں سے زیادہ تر فرانسیسی وسیلے کے مرہونِ منت ہیں۔ انگریزی املا خارجی اثرات کی قدم قدم پر نشاندہی کرتا ہے اور بہت سے الفاظ کے فرانسیسی املے اب امریکیوں نے بدلے ہیں۔ فرانسیسی تہذیب و ثقافت یورپی تاریخ میں اپنی مثال آپ رہی ہے، جس کے اثرات اسکینڈی نیویا تک پھیلے۔ لاطینی کے زوال کے بعد یورپ کی ثقافتی زبان کی حیثیت فرانسیسی کو ہی حاصل ہوئی۔

فرانسیسی گفتگو کا آہنگ INTONATION بہت ہموار ہے۔ اس زبان میں صوتی اتار چڑھاؤ کی افراط و تفریط نہیں ملتی، بلکہ اس کی لے مسلسل اور مدھم ہے، جس سے زبان میں لگی ترنم غنائیت آگئی ہے۔ اسلوب (STYLE) کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ یک حرفی الفاظ MONOSYLLABLES مسلسل نہ استعمال ہوں، تاکہ موسیقی قائم رہے۔ یہ ہلکا اور مسلسل اتار چڑھاؤ اسکینڈی نیویا کی بعض زبانوں یا لہجوں کے بالکل برعکس ہے، جن کے پے بہ پے جھٹکے سننے والے کو حیران کر دیتے ہیں۔ خود انگریزی میں آواز کا اتار چڑھاؤ خاصا نمایاں اور جھٹکے دار ہے۔ یورپی زبانوں کی بابت سولھویں صدی کے ہسپانوی شہنشاہ چارلس پنجم (۱۵۰۰-۱۵۵۸ء) کی طرف یہ دلچسپ جملہ منسوب ہے:

"انگریزی مرغیوں سے بولنے کے لئے ہے، جرمن گھوڑوں سے، اطالوی عورتوں سے، فرانسیسی فلسفیوں سے، اور ہسپانوی سلاطین اور مطلق العنانوں سے۔"

فرانسیسی فلسفیوں سے بولنے کی زبان ہے اس لئے کہ اعلیٰ ادبی فرانسیسی ہمیشہ انسانی دماغ کی اعلیٰ نفاستوں سے متمول رہی ہے۔ جب تک اہلِ زبان اپنی زبان یا اپنے قلم سے نکلنے والے الفاظ اور ان کے باہمی روابط کی طرف مسلسل ملتفت نہ رہیں صحیح فرانسیسی لکھنا یا بولنا ممکن ہی نہیں کہا جاتا ہے، زبان کان سے سیکھنے کی چیز ہے۔ تلفظ اور لب و لہجہ کی حد تک یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن جب تک انسان ادیبوں کی تحریریں نہ صرف پڑھے، بلکہ ان کا غائر مطالعہ کرے، اعلیٰ ادبی زبان تک جسے جرمن HOCHSPRACH کہتے ہیں، رسائی ممکن نہیں۔ اس کے بغیر ادبی گفتگوئیں قاری کے سر پر سے گزر جاتی ہیں، اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ کون سی لفظی اور معنوی خوبیاں اور لطافتیں تقریر کا حسن تھیں۔ صحیح زبان سیکھنے کے لئے کان کے علاوہ آنکھ اور ذہن کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے اور یہ ضرورت شاید سب سے زیادہ فرانسیسی زبان سیکھنے والے کو محسوس ہوتی ہے۔

فرانسیسی دنیا کی رواں ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ بولتے وقت لفظ سے لفظ پیوست ہو جاتا ہے۔ LIAISON یا انسلاکِ لفظی فرانسیسی میں قانون کا درجہ رکھتا ہے، انگریزی میں ایک حد تک عادتاً رائج ہے اور جرمن میں عیب سمجھا جاتا ہے، جہاں ہر لفظ الگ الگ واضح ARTICULATE بولا جانا چاہئے۔ فرانسیسی میں اگر کوئی لفظ حرفِ علت سے شروع ہوتا ہے، تو عبارت میں اس سے پہلے واقع لفظ کے آخری حرفِ صامت (CONSONANT) سے ملا کر پڑھیں گے، خواہ اس حرفِ صامت کا تلفظ اس لفظ کی مجرد شکل میں ادا ہوتا ہو یا نہیں۔ مثلاً سو کے لئے CENT کا تلفظ 'ساں' ہے اور سال کے لئے AN کو 'آں' پڑھتے ہیں، لیکن سو برس کو CENT ANS 'ساں تاں' پڑھا جاتا ہے۔ اس انسلاک کی روایت نے فرانسیسی املے کو کسی حد تک پیچیدہ بنا دیا ہے۔ لفظ کا حسن یہ ہے کہ وہ حرفِ علت پر ختم ہو۔ لیکن LIAISON کی غرض سے تحریر میں لفظ کے آگے اس حرفِ صامت، مثلاً T ، S وغیرہ، کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، جسے مفرد لفظ میں نہیں، صرف مسلسل عبارت میں پڑھتے ہیں، جیسے مذکورہ بالا مثال میں CENT کا T۔ اس لئے اگر کوئی شخص رسم خط سے اچھی طرح واقف ہے تو فرانسیسی پڑھتے وقت غلطی نہ کرے گا اور عبارت پڑھنے کے لئے کسی تلفظ کی لغات کا محتاج نہ ہوگا، لیکن کوئی نیا لفظ لکھتے وقت لغات میں املا دیکھنا ناگزیر ہوتا ہے۔

انگریزی میں لہجہ ACCENT کی خاص اہمیت ہے، لندن، آکسفورڈ، کیمبرج سبھی اپنے تلفظ کو افضل قرار دیتے ہیں۔ انگلستان کے ہر منطقے کا اپنا جدا لہجہ ہے۔ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں بولی جانے والی انگریزی اپنا الگ مزاج رکھتی ہے۔ کناڈا اور آسٹریلیا میں اس کا استعمال جداگانہ ہے۔ امریکی انگریزی یا امریکن کا پرچار بہت سننے میں آتا ہے۔ لیکن درحقیقت ممالکِ متحدہ میں کم از کم چار نمایاں لہجے اور زبان کے استعمال ملتے ہیں۔ مشرقی لہجہ برطانیۂ عظمیٰ کے زیر اثر ترتیب پاتا۔ وسطی امریکہ پر براعظم یورپ کا لہجہ غالب ہے۔ مغرب اور جنوب میں ہسپانوی اثرات ملتے ہیں، اور سیاہ فام امریکیوں کا تلفظ اور لہجہ سبھی سے ممتاز اور افریقی ہے۔ پھر لطف یہ کہ کسی ایک لہجہ کو دوسروں پر اصولاً فضیلت نہیں۔ بی۔بی۔سی، لندن پر نشر ہونے والا تلفظ محض ان میں سے ایک GIVEN PRONUNCIATION ہے۔ اسے رواداری کے خیال سے معیاری نہیں کہا جاتا اس لئے ہر طرح کی انگریزی سمجھنے میں اچھا خاصا بین الاقوامی تجربہ رکھنے والوں کو بھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔

فرانسیسی کے بھی متعدد لہجے ہیں، پیرس میں تلفظ پر حلقی آواز

کا اثر ہے۔ بلجیم اور فواح کی فرانسیسی جرمن اور فلے مشس FLEMISH سے متاثر ہے۔ جنوبی فرانس کے لہجے پر ہسپانوی اور اطالوی اثرات نمایاں ہیں، اور خاص طور پر "ر" کا تلفظ خوب کھنکدار سنائی دیتا ہے۔ لیکن فرانس میں اعلیٰ زبان کا معیار یہ ہے کہ بے لہجے کے SANG ACCENT بولا جائے۔ اس لئے پڑھے لکھے لوگ اپنے لہجے کو زیادہ سے زیادہ ہلکا اور معیاری بنانے کی کوشش برابر کرتے رہتے ہیں۔ معیاری لہجے کا منطقہ دریائے لوار LOIRE اور اس کی معاون ندیوں کی سرزمین مانی جاتی ہے، جو پیرس کے جنوب مغرب میں واقع ہے، اور قدیم سلاطینِ فرانس کے تاریخی محلات سے بھرپور ہے۔

انگریزی کے بعض اوقات کرخت اور ہسپانوی کے کھنکدار تلفظ کے مقابلے میں ہم اردو دانوں کو فرانسیسی لہجہ بالکل اپنا جیسا لگتا ہے۔ اگر ہم فرانس کے کسی رستوراں میں بیٹھ کے زیادہ توجہ کئے بغیر اہلِ ملک کی گفتگو سنیں، تو گمان ہوتا ہے کہ وہ لوگ اردو بول رہے ہیں۔ اس کا سبب ان دونوں زبانوں کی لسانی ساخت کی ہم آہنگی ہے، جو غالباً آریائی زبانوں اور لاطینی کی مطابقت کے باعث ہے۔ معیاری انگریزی بولتے وقت دہانہ کھلتا ہے، نچلے جبڑے کو عمودی حرکت ہوتی ہے۔ صرف امریکی نیگرو لہجہ ادا کرنے کے لئے دہانہ افقی طور پر (دائیں بائیں) کھلتا بند ہوتا ہے۔ بعض ہندوستانی زبانیں اور بولیاں بھی دہانے کی افقی حرکت کی متقاضی ہوتی ہیں، لیکن معیاری اردو گفتگو کے دوران دہانہ نیم باز ہو کے رہ جاتا ہے اور حرکت صرف ہونٹوں کو ہوتی ہے۔ تقریباً یہی حال معیاری فرانسیسی بولنے کا ہے۔ فرانسیسی زبان میں جو قدیم گول آوازیں او اور اؤ وغیرہ قسم کی ہیں، وہ البتہ مستثنیٰ ہو جاتی ہیں۔ یہ آوازیں اُن جرمانوی اصوات کے قبیل کی ہیں، جو ہونٹ باہر نکال کے ہی صحیح طور پر ادا کی جا سکتی ہیں، لیکن فرانسیسی میں یہ تلفظ بھی معتدل سے لگتے ہیں۔

اس مماثلت کے معاشرتی اسباب بھی ہو سکتے ہیں، جن سے قوموں کا مزاج بنتا ہے۔ فرانس اور آریہ ورت دونوں زرخیز زرعی علاقے ہیں، جہاں انسان اب سے کچھ ہی دن پہلے تک مشینوں کا غلام یا تجارتی بازی گری کا بندہ بنے بغیر خوشحال زندگی گزارتا چلا آیا تھا اور جہاں فردوسی کے الفاظ میں برائے درم لوگ تند و بدخو نہیں ہوا کرتے تھے۔ آج بھی تہذیبی شستگی و نفاست، انسانیت نوازی اور دلپذیری کی کتنی ہی ادائیں لکھنؤ اور پیرس کے قدیم شائستہ باشندوں میں مشرق و مغرب کے فرق کے باوجود مشترک ملتی ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے لکھنؤ کے بیچ سے گومتی بہتی ہے اور پیرس کے وسط سے سین۔ اقبال کو رودِ نکر (؟) میں دلی یاد آئی تھی۔ میں نے پیرس کی کتنی ہی شامیں لکھنؤ کی یادوں میں گزاری ہیں۔

(باقی آئندہ)

صفحہ ۹ سے آگے

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اور علی گڑھ منتھلی کے شماروں کی جستجو

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اس سال "علی گڑھ میگزین" کا ایک ایسا خاص نمبر (گولڈن جبلی نمبر) ترتیب دے رہا ہے جس میں "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" (۱۸۹۴ء تا ۱۹۰۲ء) "علی گڑھ منتھلی" (۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۹ء) اور "علی گڑھ میگزین" (۱۹۲۳ء تا ۱۹۷۰ء) میں اب تک شائع شدہ تخلیقات نثر و نظم کا بہترین انتخاب پیش کیا جائے گا۔ میں نے مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی) کے سرسید میوزیم اور اورینٹل ڈویژن کی ساری الماریاں چھان ماریں لیکن پھر بھی مجھے اب تک کی مذکورہ بالا میگزین کی مکمل جلدیں اور شمارے دستیاب نہ ہو سکے۔ اردو کے علمی اور تحقیقی کاموں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور ملک کے اعلیٰ کتب خانوں کے منتظمین سے التماس ہے کہ وہ "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" اور "علی گڑھ منتھلی" کی مندرجہ ذیل جلدوں اور شماروں کے بارے میں معلومات ذیل کے پتہ پر ارسال کر کے ممنون فرمائیں۔

مرزا خلیل
ایڈیٹر: علی گڑھ میگزین
شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین

جلد	شمارہ	ماہ و سال
۱	۲	جولائی ۱۸۹۴ء
۴	۱۱	نومبر ۱۸۹۶ء
۵	۴، ۶، ۷، ۹، ۱۰،	اپریل، جون، جولائی، ستمبر، اکتوبر،
	۱۱ اور ۱۲	نومبر اور دسمبر ۱۸۹۷ء
۹	۲، ۶، ۹، اور ۱۰	فروری، جون، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۱ء
۱۰	۱۲	دسمبر ۱۹۰۲ء

علی گڑھ منتھلی

جلد	شمارہ	ماہ و سال
۱	۵ اور ۶	مئی اور جون ۱۹۰۳ء
۲	۷، ۸، ۹، ۱۰	جولائی، اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۴ء
۷	۲، ۳، ۴، ۸	فروری، مارچ، اپریل، اگست،
	۹، ۱۰ اور ۱۲	ستمبر، اکتوبر اور دسمبر ۱۹۰۹ء
۸	۱، ۴، ۵، ۷، ۸	جنوری، اپریل، مئی، جولائی،
	۹، ۱۰ اور ۱۱	اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۱۰ء

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

غلام رسول

اردو کی بہترین لکھاوٹ
کا
عملی ثبوت

میں نے اردو خط کی اصلاح کے لئے کافی محنت اور کاوش کی ہے۔ اردو دوستوں کی آگاہی کے لئے "ہماری زبان" بابت ۱۵رفروری ۱۹۶۸ء میں اپنا تفصیلی مضمون "اردو کا اصلاحی رسم خط جامع ہے" کے عنوان سے شائع کرچکا ہوں۔ باوجود علم و اطلاع کے بعض مفاد پرست گاہے ماہے رسالہ یا اخبار کے ذریعہ اردو خط میں نقص و عیب بتلاکر اس کے رسم خط کے بدلنے کی رائے دیتے ہیں، حالانکہ کسی زبان کا رسم خط اس کے جسم و جان کے مصداق ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ میں نے مذکورہ بالا مضمون میں اردو اصلاحی خط کو ناگری اور رومن خطوں کے مقابلے میں جامع و مانع ثابت کیا ہے۔ ایسی تحریکوں سے اردو بولنے والوں کی حوصلہ فرسائی ہوتی اور اردو کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان باتوں سے متاثر ہوکر ان لوگوں کی رہنمائی کے واسطے "لکھاوٹ کی نئی علامتیں" بیان کرکے اردو کے جدید اعرابوں کی روشنی میں پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے اشعار غالب کا منظوم اودھی ترجمہ (جو حال ہی میں فضل ارحمان اسلامیہ کالج میگزین برٹی کے غالب نمبر بابت ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء میں شائع ہوچکا ہے) کے ذریعے اردو خط کے معترضین کو منوانا چاہتا ہوں کہ لکھاوٹ میں اردو خط، ناگری خط کا بخوبی مقابلہ کرسکتا ہے۔ اس میں غیر زبان کے الفاظ کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کی خاص صلاحیت ہے۔ اوپر کے رسالہ میں منظوم ترجمہ ناگری خط میں موجود ہے۔ ان (۲۰) اشعار میں سے بقدر گنجائش آٹھ شعروں کو ناگری خط کے ساتھ اردو خط میں مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں۔ ناظرین اخبار میں جو ناگری خط سے واقف ہیں وہی ان شعروں کی لکھاوٹ کی صحیح جانچ کرسکتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ ہی کے بعد اردو لکھاوٹ کی اہمیت سمجھ میں آئے گی۔ اردو خط کی اصلاح کا مسئلہ ختم ہوچکا ہے۔ اب ہمیں خط کی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہئے۔ میدان ہائے علم و فن میں آگے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔

لکھاوٹ کی نئی علامتیں

(۱) (ؤ)۔ یہ واوِ لین کی علامت ہے۔ مثلاً: دوڑ، حوض

(۲) (ئ)۔ یہ یائے لین کی علامت ہے۔ مثلاً: پیڑ، بیٹر۔

(۳) (ی)۔ یہ درمیانی یائے معروف کی علامت ہے۔ مثلاً: تیر، کھیر

(۴) (ں)۔ یہ ادھوری آواز کی علامت ہے۔ یہ غنہ کہلاتی ہے۔ اپنی اور پرائی زبان کے لفظوں کے لئے۔ مثلاً: کیا، کیوں (اردو)، ستان، شری (ہندی)، اور سکول، بلاک (انگریزی)۔

(۵) (ڑ)۔ یہ راء ممدودہ کہلاتی ہے اور ہندی سنسکرت کی (ऋ) کا بدل ہے۔

(۶) (ش)۔ یہ شین ثقیلہ کہلاتی ہے اور سنسکرت شین (مثلاً کرپا، امرت۔ (ष) کا بدل ہے۔ مثلاً: کوش (کوش)، دوش (دوش)۔

(۷) (ن)۔ یہ نون ثقیلہ کہلاتی ہے اور سنسکرت انگر (ण) کا بدل ہے۔

(۸) (ی)۔ یہ یائے قیصیر کہلاتی ہے اور ہندی، برج اور اودھی کے لئے خاص ہے اس کی ادا زیر سے زیادہ ہے۔ مثلاً: نائیکا، تاہی، ناہی۔

وقار خلیل

تحریر کی خوشبو

(بیاد مرحوم سلیمان اریب)

صبا کے دوش پہ تھی پُرفشاں
تحریر کی خوشبو
صدا کے گونجتے جنگل میں اک شمعِ جنوں فرزاں
سراسیمہ، اداس اور مضمحل
کوچہ بہ کوچہ، زخم خوردہ منتشر
ستمبر کے دھے کی ایک شب کتنی ستمگر تھی
نہ دامن کی خبر تھی اور نہ تھا پاس گریباں ہی
مگر پلکوں پہ قطرہ قطرہ اشکِ غم نمایاں تھا
صبا کے دوش پہ تھی پُرفشاں
تحریر کی خوشبو

غالب کے آٹھ اشعار کا منظوم اودھی ترجمہ
(اردو اور ناگری لکھاوٹ میں)

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(ترجمہ) دستر پہنے کاگد کیرا چتر ہر ایک چلائے
کونے چنچل اپنے قلم سے ہم کا درس بنائے

दस्तर पहने कागद केरा चित्र हरेक चिल्लाय।
कौने चंचल अपने कलम से हमका दिरस बनाय॥

(۲) ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

(ترجمہ) جیون جب دو دیس کا ٹھہرا موہ نہ کاہے ناپ نچائے
مرتیو نہ ہو تو جیون کیرا سواد نہ کو ذیا پائے

जीवन जब दो देश का ठहरा मोह न काहे नाच नचाय।
मृत्यु न हो तो जीवन केरा स्वाद न कोऊ पाय॥

(۳) فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموس وفا کیا

(ترجمہ) تنکے کی چنگاری کا ہے چھن بھر میں بجھ جائے
پریم کا پالن پریم کا آدر لوبھی جان نہ پائے

तिनके की चिंगारी का है छन भर में बुझ जाय।
प्रेम का पालन प्रेम का आदर लोभी जान न पाय॥

(۴) دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

(ترجمہ) بندن بھیتر جھانک کے دیکھو ساگر مارے ٹھاٹ
ہم ہے ماہی بھگوان بست ہے پوچھ نہ ہمری جات

बुन्दन भीतर झाँक के देखो सागर मारे ठाठ।
हम है माहि भगवान बसत है पूछ न हमरी जात॥

(۵) سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

(ترجمہ) سُن لے لوٹن ہارے من کے سُن لے شرون کھول
ٹوٹے من کا بول ہی کا ہے بیکا بول امول

सुनले लूटन हारे मन के सुनले श्रवन खोल।
टूटे मन का बोलहि का है बरका बोल अमोल॥

(۶) منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

(ترجمہ) ڈھانپے منہ پر شوبھا وہ کی دیکھے ناہیں دیکھی جائے
کیسن سیتی گھونگھٹ وہ کا ادھیکے روپ سجائے

ढाँपे मुहँ पर शोभा वहकी देखे नाहि देखी जाय।
केसन सेती घूघट वहका अधिके रूप सजाय॥

(۷) تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

(ترجمہ) تو تو اپنے الکن کے بل سلجھائے اور سجائے
دور دریشٹی مورے من کی کہاں کہاں الجھائے

तू तो अपने अलकन के बल सुलझाय और सजाये।
दूर दृष्टि मोरे मन की कहाँ-कहाँ उलझाय॥

(۸) ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(ترجمہ) جیون چھل ماں آیو نہ غالب جیون چلی بھرتی چھال ہی
اپنے بھرم کے جال کا گھیرا اور رو جگ ہے یوں کچھ ناہی

जीवन छल में आयो न ग़ालिब जीवन कही फिरती छाँहि।
अपने भरम के जाल का घेरा और जग है यों कुछ नाहि॥

▲

صفحہ ۵ سے آگے

جلد	شمارہ	ماہ و سال
۹	۱ تا ۱۲	جنوری ۱۹۱۱ء تا دسمبر ۱۹۱۱ء
۱۰	۱، ۲، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ اور ۱۲	جولائی، اگست اور دسمبر ۱۹۲۱ء
۱۱	۱، ۲، ۳ اور ۵	جنوری، فروری، اپریل اور مئی ۱۹۱۲ء
۱۲	۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ اور ۱۲	فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون اور دسمبر ۱۹۱۴ء
۱۳	۴، ۷، ۸، ۹ اور ۱۰	اپریل، جولائی، اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۱۵ء
۱۴	۱ تا ۱۲	جنوری ۱۹۱۶ء تا دسمبر ۱۹۱۶ء
۱۵	۱ تا ۱۲	جنوری ۱۹۱۷ء تا دسمبر ۱۹۱۷ء
۱۶	۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ اور ۷	جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون اور جولائی ۱۹ء

علی گڑھ

●



مراسلات

نو دریافت دیوان غالب کی تدوین

دیوان غالب کے نو دریافت نسخہ بھوپال کو بعض نام بر آوردہ اہل تحقیق نے "غالب کا خود نقل کردہ نسخہ دیوان اردو" قرار دیا ہے اور اس کی بابت کہا ہے کہ "میرزا صاحب نے منگل ۲۰ رجب ۱۲۳۱ھ کو تمام کیا" یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کتابت سے فرصت پانے کے بعد مرزا نے اس پر نظر ثانی کی اور کلام کی اصلاح کی، اس کام سے ان کو اس زحیت کی روایتوں کے مطابق ۱۲۳۵ھ میں فرصت ہوئی۔ اس قسم کی روایتوں کے واضعوں کے پاس اس سلسلے میں نہ کوئی مستحکم بنیاد ہے اور نہ کوئی ایسی دلیل جو محض قیاس پر مبنی نہ ہو، میں نے یکم اگست ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں متعلق امور اور خود مرزا کے انداز خط سے بحث کرتے ہوئے یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ یہ سب مفروضات ہیں، محض بے بنیاد کہا گیا ہے کہ

"اگر حمیدیہ گم نہ ہوا ہوتا تو بھی یہ نسخہ اس لئے قابل قدر تسلیم کیا جاتا کہ یہ اقدم بھی تھا اور خود بقلم شاعر بھی لیکن اب تو صرف یہی نسخہ ہے جو ہر لحاظ سے بے بہا اور نایاب ہے"

یہ دعویٰ ہے لیکن اس دعوے سے پہلے دونوں نسخوں سے معاملات و مسائل پر متعلق غور نہیں کیا گیا یا اگر کچھ غور کیا تو اپنے مفروضات کی روشنی میں اور ظاہر ہے کہ ایسے غور و فکر کو تحقیق سے کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔

نسخہ حمیدیہ کی بابت ہمیں معلوم ہے کہ اس کی کتابت حافظ معین الدین نے ۱۲۳۷ھ میں کی، اس کے بعد کسی زمانے میں یہ مرزا غالب کے پاس "تصحیح و ترمیم" کے لئے بھی گیا اور جیسا کہ تسلیم کیا گیا ہے اس پر مرزا کے ہاتھ کی اصلاحات موجود ہیں۔ نو دریافت نسخے میں متن عام طور پر وہی ملتا ہے جو نسخہ حمیدیہ میں ہے، دونوں میں قابل ذکر حد تک مطابقت ہے لیکن کاملاً نہیں ہے۔ یہ مطابقت اس بات کی مظہر ہے کہ ایک کی تدوین کے وقت دوسرا وجود میں آ چکا ہوگا، اختلافات کی موجودگی اس حقیقت پر دال ہے کہ ایک کے مدون کے پیش نظر دوسرا نسخہ نہ رہا ہوگا۔ ایسی صورت میں کسی ایک کا مختصر ہونا لازماً اس کی قدامت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دونوں کے زمانے پر غور کرنا ہوگا۔ نسخہ حمیدیہ میں ایک مطلع یہ ہے ؎

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری افتادسے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

نو دریافت نسخہ میں اس غزل کے شروع میں ایک مطلع لکھا ہوا تھا جسے بعد میں اس طرح کاٹ دیا گیا ہے کہ اب اس کا پڑھ لیا جانا ممکن نہیں۔ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ قلمزد مطلع وہی ہوگا۔ یعنی نو دریافت نسخے کی کتابت کے وقت تک مطلع مذکور غالب کے مستند کلام میں شامل تھا۔ بعد کے کسی زمانے میں مرزا نے اسے اپنے کلام سے خارج کر دیا ہوگا۔ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد نو دریافت نسخے میں بھی یہ مطلع قلمزد کر دیا گیا یعنی یہ واقعہ نسخہ حمیدیہ کی اصلاحات کے بعد کا ہے۔ اگر بفرض محال یہ تسلیم کریں کہ یہ واقعہ (مطلع کا قلمزد کرنا) نسخہ حمیدیہ کے وجود سے پہلے کا ہے اور مرزا خود اپنے قلم سے اسے کاٹ چکے تھے تو نسخہ حمیدیہ میں جو تصحیح و ترمیم کے لئے ہی مرزا کے سامنے پیش ہوا تھا اس کا قایم و باقی رہ جانا ممکن نہ تھا۔

نسخہ حمیدیہ میں اشعار کا جو متن مندرج ہے وہ ہے جو غالب کی نظر سے اس کے گذرنے کے وقت تک خود شاعر کی نگاہ میں کلام کی آخری اور قطعی صورت تھی، اس میں جو بھی ترمیم ہوئی ہوگی لازم ہے کہ بعد ہی میں ہوئی ہوگی، اس سلسلے کی ایک شہادت بھی مسئلہ کو طے کر دینے کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر نسخہ حمیدیہ میں ایک مقطع یہ ہے ؎

اسدؔ کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہے نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

نو دریافت نسخے میں ابتداءً یہ مقطع اسی طرح لکھا تھا۔ بعد میں کاٹ کر پہلے مصرع کو اس طرح بنایا گیا ہے ؎

اسدؔ کو بت پرستی عالم درد آشنائی ہے

اور اس ترمیم یا اصلاح سے نسخہ حمیدیہ محروم ہے صاف ظاہر ہے کہ اس ترمیم کا زمانہ بعد کا ہے ایک اور شعر نسخہ حمیدیہ میں اس طرح تھا ؎

آئینہ خانہ ہے صحن چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بے خود و وارفتۂ حیرانگی صبح

نو دریافت نسخے میں بھی ایسا ہی لکھا تھا البتہ بعد میں، یکسر، کو یکدست، بنا کر مصرع اولیٰ کو درست کیا گیا۔ یہ اصلاح بھی بہ سبب زمانۂ مابعد سے متعلق ہونے کے نسخہ حمیدیہ میں شامل نہیں ہو سکی۔ ایک اور مقطع اس طرح تھا ؎

نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا اس قدر بزم اسدؔ گرم تماشا ہو

نو دریافت نسخے میں بعد میں کاٹ کر مصرع ثانی کی اس طرح اصلاح کی گئی ؎

خدایا بزم غالبؔ اس قدر گرم تماشا ہو

۱؎ غالب کا خود نقل کردہ نسخہ دیوان اردو۔ از مولانا امتیاز علی خاں عرشی
رسالہ آجکل دہلی، جولائی ۱۹۶۹ء

یہ اصلاح تو بادی النظر میں بھی زمانہ مابعد کی ہے۔

ان صریحی شہادتوں کے بعد نودریافت نسخے کو "اقدم" کہنے کی کوئی وجہ نہیں، اس کی کتابت اور اصلاح نسخۂ حمیدیہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس موقع پر یہ شبہہ ضرور ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ نودریافت نسخہ کی تکمیل اگر زمانہ مابعد میں ہوئی تو یہ نسخۂ حمیدیہ سے مختصر کیوں ہے؟ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ نودریافت نسخے کے مدون کے پیش نظر نہ تھا، نسخۂ حمیدیہ کے مدون کے وسائل اتنے تھے کہ وہ اسے خود مرزا غالب کی نظر سے گذار سکتا تھا، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ کلام فراہم کرلینا ممکن تھا۔ نودریافت نسخے کا مدون اغلب ہے کہ کوئی ایسا شخص تھا جو غالب سے عقیدت کے باوجود ان سے دور تھا، اس نے کلام غالب کی فراہمی کی نہایت کوشش کی لیکن اس کا مرزا سے تعلق اتنا نہ تھا کہ وہ براہ راست ان سے فیض پاتا وہ مرزا کے املا سے بھی پوری واقفیت بہم نہیں پہنچا سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک مصرع اس طرح لکھا ہے

باغ تجزل طپیدن و آب رواں اشک

نسخۂ حمیدیہ میں یہ مصرع اسی طرح ہے فرق یہ ہے کہ اس میں طپیدن کا املا مرزا کے مسلک کے مطابق ہے یعنی "ط" کی جگہ "ت" لکھا ہے۔

نودریافت نسخے کے کاتب نے جا بجا کم سوادی بلکہ اپنے غیر موزوں طبع ہونے کے نشانات بھی چھوڑے ہیں مثلاً ایک مصرع اس طرح لکھا تھا

شرار فرصتے سرمایہ چمن میں چراغاں ہے

"فرصتے" میں اضافت کے مقام پر یائے مجہول لکھنا قابل ذکر بات ہے، پھر مصرع ناموزوں بھی ہے۔ نظر ثانی میں اسے درست کیا گیا ہے

شرر فرصت نگہ سامان یک عالم چراغاں ہے

اور یہ صورت وہ ہے جو نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے۔ اس مثال سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نودریافت نسخہ میں تصحیح سے پہلے کلام کی جو صورت ملتی ہے وہ لازماً صحیح اور قابل اعتماد نہیں اور اس کی بنیاد پر مرزا کی شاعری، ان کی صلاحیت اور ان کے انداز فکر سے متعلق حکم لگانا کبھی کبھی ان کے ساتھ ظلم بھی ہوگا۔ ظاہراً نودریافت نسخے کا صرف اصلاح شدہ متن نسبتاً قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔

کہا جا چکا ہے نودریافت نسخے کا مدون غالب کے کلام کی صحیح ترین صورت کی جستجو میں رہا اور جب بھی اسے معلومات حاصل ہوئیں اس نے انھیں اپنے نسخے میں جگہ دی لیکن اس کوشش کے باوجود نسخۂ حمیدیہ کی بھی تمام اصلاحات اسے دستیاب نہ ہو سکیں اور اس کا نسخہ ان سے محروم رہا۔ نودریافت نسخے کے مدون کو اپنی کوششوں میں کبھی کبھی دھوکا بھی ہوا، اس نے دوسرے شاعر کے کلام کو بھی کلام غالب سمجھ لیا، یہ وہ غلطی ہے جس کی غالب کے احباب و تلامذہ سے بھی عام طور پر امید نہیں کی جاتی۔ اس کی ایک مثال ۵ ستمبر ۷۰ء کے "ہماری زبان" میں پیش کرچکا ہوں کہ نودریافت نسخے میں ایک ایسی غزل بھی موجود ہے جس پر اس زمانے میں خمسہ لکھا جا چکا تھا جب مرزا کی عمر تین سال سے زیادہ نہ تھی۔ بخوبی امکان ہے کہ اس نسخے میں ایسا ہی اور کلام بھی تلاش و جستجو سے مل جائے۔

علی گڑھ • محمد انصار اللہ

غالب کے نودریافت نسخے کے بارے میں

(۱)

یکم اگست ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" میں محمد انصار اللہ صاحب نے دیوان غالب کے نودریافت نسخے کے انداز خط سے جس طرح بحث کی تھی اردو میں اس کی مثال کم ملے گی، افسوس ہے کہ انھوں نے جن نکات کی طرف توجہ دلائی تھی کسی نے بھی ان پر غور نہ کیا، "خوش زادہ" ذات اسے آگے نہ بڑھ سکے۔ بہر حال اب ۵ ستمبر کے شمارے میں اس بابت انھوں نے جو "انکشاف" کیا ہے وہ اس جعلی مخطوطے کے "خروج" کے بعد سب سے اہم علمی واقعہ ہے۔ اب وہ طلسم پورے طور پر ٹوٹ چکا ہے جس میں پوری اردو دنیا اب تک گرفتار رہی ہے۔ میں ان کے اس غیر معمولی کارنامے پر اور ان کی ہمت و جرات پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

غزل "دم چند رہا" کی بابت قاضی محمد ارج دھولپوری صاحب نے اعتراف کیا تھا کہ قافیہ میں یائے مجہول چاہیے (یعنی دے چند) چاہتا ہوں کہ محمد انصار اللہ صاحب اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالیں۔

کانپور • اشفاق حسین

(۲)

۵ ستمبر ۷۰ء کے "ہماری زبان" میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا "انکشاف" دیکھا۔ اس نے ہمیں مجبور کردیا کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی بے مثل تحقیقی صلاحیتوں کا اور انھوں نے اس "انکشاف" کے ذریعہ اردو ادب پر جو احسان کیا ہے اس کا اعتراف کریں لیکن کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے ناقدین اور محققین عام طور پر شخصیت پرست یا ظاہر بین ہیں اور وہ ہر قسم کے دھوکے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ میں اس "انکشاف" کے لئے ڈاکٹر صاحب کی اور آپ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

ایک بات میرے خیال میں بھی آتی ہے کہ اگر یہ دیوان غالب کا ابتدائی دیوان ہوتا تو اس میں اسیر و شوکت کا بھی کہیں نہ کہیں ذکر ہوتا جیسا کہ انھوں نے خود اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔ اس نکتہ کی طرف بھی ڈاکٹر صاحب کو توجہ کرنی مناسب تھی۔

لکھنؤ • زبیدہ انجم

(باقی صفحہ ۵ کالم ۲)

اخبار و اذکار

سلیمان اریب کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

ذہن جدید کی طرف سے حسن نعیم کی قیام گاہ پر مشہور ادیب سلیمان اریب کے انتقال کے سلسلے میں عتیق حنفی کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ اور مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

قرارداد

ذہن جدید کے تحت منعقد ہونے والا دلی کے ادیبوں کا یہ جلسہ اردو کے مشہور شاعر سلیمان اریب کی موت پر اظہار افسوس کرتا ہے۔

سلیمان اریب کی موت کینسر کے موذی مرض سے ہوئی اور یہ موت پھر اس ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو اس عدم تحفظ اور بے سر و سامانی کا احساس دلاتی ہے جو اس ملک کے تخلیق کار کا مقدر بن گئی ہے۔ ہم اس ملک کے دانشوروں ہی سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کب تک ایسی تخلیقی موتوں پر ماتم کرتے رہیں گے۔ سلیمان اریب کی موت تخلیقی دنیا کو پھر ایک لمحۂ فکریہ دیتی ہے۔ جدید ادب، تخلیق اور تخلیق کار کی اس بے سر و سامانی اور عدم تحفظ کے خلاف اپنے احتجاج کا اظہار کرتا ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ اردو کے سبھی ادیب 'صبا' کو زندہ رکھنے اور سلیمان اریب کے ادبی منصوبوں اور ان کی بیوی صفیہ اور ان کے بیٹے حسین کے تئیں ہر ممکن تعاون کریں گے۔

• زبیر رضوی

انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ

۱۵ ستمبر کو شعبۂ آرٹ اینڈ کرافٹ ایجوکیشن، جامعہ ملیہ نئی دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک نشست ڈاکٹر سلامت اللہ، پرنسپل ٹیچرز کالج جامعہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

ڈاکٹر اطہر انصاری، ریڈر شعبہ تاریخ جامعہ کالج نے حسب ذیل موضوع پر انگریزی میں اپنا مقالہ پڑھا:

STUDY OF WEST ASIAN HISTORY IN INDIAN UNIVESITIES

مقالے پر بحث میں ڈاکٹر سلامت اللہ، انور صدیقی، ڈاکٹر اجمل اجملی، رشید نعمانی، عبید الحق وغیرہ نے حصہ لیا۔

دیگر ... کے سلسلے میں مقالہ نگار کی تجاویز سے سب نے اتفاق کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اجمل اجملی نے ایک مختصر نظم اور انور صدیقی نے تازہ غزل سنائی۔

سکریٹری انجمن ڈاکٹر سیفی پریمی کی تجویز پر اسی جلسہ میں اگلی میٹنگ کا ایجنڈا مرتب ہوا جس میں انور عظیم کی کہانی اور غلام ربانی تاباں کی غزل شامل کی گئی۔

• سیفی پریمی سکریٹری

اردو رسم الخط پر سمپوزیم

بہرائچ:۔ بنگال کے ممتاز اردو ادیب اور محقق ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی آمد کے موقع پر سنگم ہوٹل میں اردو رسم الخط پر ایک سمپوزیم ہوا جس میں مہمان ادیب کے علاوہ ساغر مہدی اور ڈاکٹر این۔ ایم خیالی نے موضوع پر بحث کی۔ ڈاکٹر شانتی رنجن نے کہا کہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اس زبان کا رسم الخط بھی ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ ساغر مہدی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی زبان کا رسم الخط غیر سائنٹفک ہونے کے باوجود اپنے اندر بڑی مضبوط اور گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جس سے زبان الگ نہیں کی جاسکتی۔ ڈاکٹر این۔ ایم۔ خیالی نے کہا کہ [illegible] ان کا اپنا ایک حسن فن ہے۔

• قومی آواز

بہرائچ کے کالج میں اردو تعلیم جاری کرنے کا وعدہ

بہرائچ: ریجنل انسپکٹرس مسز بی۔ مترا سے جناب نظام الدین خاں ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر عبدالرحمن پر مشتمل ایک وفد نے بہرائچ کے ال۔ آر۔ پی ڈاک بنگلہ میں اور ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں نے نانپارہ کے مجگواں بالیکا ہائر سکنڈری اسکول میں ملاقات کرکے تارا گرلس کالج میں اردو کی تعلیم میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام عائد کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس ناانصافی کی تلافی کریں۔ ریجنل انسپکٹرس نے اردو کی تعلیم جاری کرنے کا وعدہ کیا۔

ریجنل انسپکٹرس نے کہا کہ انھوں نے پرنسپل اور منیجر کالج کو ہدایت کردی جبکہ کالج کو سہ لسانی فارمولا کے تحت اردو کی امداد ملتی ہے تو اردو پڑھنے والی طالبات کی راہ میں کوئی دشواری نہ ہونا چاہئے۔

مسز مترا سے شکایت کی گئی کہ انتظامیہ کمیٹی نے یہ دستور بنایا ہے کہ وہ اردو ٹیچر کا تقرر اکتوبر میں کرتی ہے اور مئی میں نوٹس دے کر علیحدہ کردیا جاتا ہے اس طور پر ٹیچر کی حق تلفی کے ساتھ اردو کی گرانٹ کا استعمال بھی صحیح طریقہ پر نہیں ہو پاتا ہے۔ انسپکٹرس صاحبہ نے کہا کہ تقرر جولائی سے جون تک مسلسل ہونا چاہئے اور وہ اس مسئلے پر انتظامیہ کمیٹی کو متوجہ کریں گی تاکہ اس تقرر کے معاملہ پر دیانت دارانہ طور پر عمل درآمد ہوسکے۔

• قومی آواز

صوبائی زبانوں کا اردو کے مقابلہ میں دعویدار بن جانا ناگزیر ہے۔ سندھی پہلے سے ابتدائی تعلیم کا ذریعہ اور صحافت کی زبان کی حیثیت سے رائج رہی ہے۔ صوبہ سرحد میں مادری زبان پشتو کی ترقی و ترویج کا پروگرام خدائی خدمت گار تحریک کا ایک اہم ستون رہا ہے اور خان عبدالغفار خاں کی ان تھک کوشش کی وجہ کر پشتو ابتدائی تعلیم کے ذریعہ کی حیثیت سے موسوم ہوا رائج ہو چکی ہے۔ صرف پنجاب ایک ایسا علاقہ رہا ہے جس نے اردو کو مکمل طور پر اپنی تعلیمی، تہذیبی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنا لیا تھا۔ ایک زمانے سے لاہور اردو کا دارالاشاعت رہا ہے۔ اقبال کی ذات گرامی نے اہل پنجاب کو وہ خود اعتمادی بخشی کہ اہل لکھنؤ کا منہ چڑانے لگے اور اہل دہلی کے منہ آنے لگے لیکن تقسیم ہند سے قبل بھی ان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک ایسا گروہ موجود تھا جس کے دل میں یہ خلش موجود تھی کہ پنجابی کو اردو کی جگہ لینی چاہئے۔ پطرس بخاری اور دین محمد تاثیر جیسے اردو کے ادیب اس تحریک کے منکرین میں سے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور سے پنجابی ماہنامہ "پنج دریا" کا اجرا اور بعد کو اردو روزناموں میں پنجابی کے لئے چند کالموں کا وقف کر دینا، اس طرح پنجابی کی تحریک جاری رہی۔ مغربی پاکستان کے ایک یونٹ کو توڑ دینے کے بعد پنجابی کے احیاء کی تحریک کا زور پکڑ جانا لازمی امر ہے۔ حال میں پنجاب کے کئی دانشوروں کے دستخطوں سے پنجابی کی تائید میں ایک محضر بھی حکومت پاکستان کو پیش کیا گیا ہے جس کی رو سے پنجابی کو ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنانے اور اس کی ترقی کے لئے دیگر سہولتوں کی مانگ کی گئی ہے۔ دستخط کرنے والوں میں حفیظ جالندھری جیسے اردو کے نمک خوار، ابن انشا اور فیض احمد فیض جیسے فرزندان دلپذیر بھی شامل ہیں۔ اس وقت ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں پنجابی اپنی انفرادیت کی تلاش میں ہے۔ ہندوستان میں سکھ قیادت نے اسے ایک نئے منصب پر لا کھڑا کیا ہے۔ پنجابی ہندو پنجابی اور اردو دونوں سے منہ موڑ کر ہندی سے اپنا رشتہ جوڑ رہا ہے۔ پاکستانی پنجابی مسلمان ایک اردو نما پنجابی کی تخلیق کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اردو نما اس لئے کہ بہرحال جہاں تک رسم خط، الفاظ اور مصطلحات علمیہ کا تعلق ہے اس کو وہی رکھنے پڑیں گے جو اردو کی دین ہیں لیکن زبان کا بنیادی ڈھانچہ دہلوی نہیں لاہوری بنا دینے کی نیت ہے۔ اس طرح ہندوستانی پنجاب میں گورمکھی رسم خط کی پنجابی ہوگی اور پاکستانی پنجاب میں اردو رسم خط (جسے غالباً وہ عربی فارسی کہیں گے) میں تحریر کردہ پنجابی، رسم خط اور الفاظ و فرہنگ کا خلاف ستقبل دونوں پنجابیوں کے درمیان قائم رہے گا، جس کی وجہ سے بنگالی کی سی صورت حال پیدا نہ ہو سکے گی۔

اس وقت یہ بتانا دشوار ہے کہ مغربی پاکستان میں پنجابی، سندھی اور پشتو کے ارتقا کے بعد اردو کے لئے کیا مقام رہے گا۔ اردو بولنے والی پندرہ فی صد آبادی اردو سے بے وفائی کے اس دور میں کہاں تک وہاں کی زبانوں کے مقابلے میں ڈٹی رہے گی۔ رابطے کی زبان کی حیثیت سے انگریزی کی موجودگی میں اردو کا یہ منصب بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ پاکستان کے افق سے جو تاریک سائے اردو کی جانب بڑھ رہے ہیں اسے اردو کے سب سے بڑے جابر شاعر جوش نے سرزمین پاکستان پر قدم رکھتے ہی اس المیہ طربیہ انداز میں محسوس کیا تھا ؎

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفے میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

اردو کی شہادت کے اس دور میں کیا یہ بہتر نہیں کہ اردو والے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز اردو کے گھر یعنی ہندوستان کو بنا دیں؟

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جذبہ و آواز (مجموعہ کلام)

مصنف : مسن موہن تلخ
ناشر : ورشا پبلیکیشنز دہلی
صفحات : ۷۰
قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

عکس حیات (تاریخ اردو ادب)

مصنف : حمید قیصر
ناشر : ادارہ صبح نو، مولیہ
صفحات : ۲۸۴ قیمت : دو روپے

اردو ادب میں سکھوں کا حصہ

مصنف : امام مرتضیٰ نقوی
ملنے کا پتہ : بک کارنر، امروہہ
صفحات : ۴۰۴
قیمت : پندرہ روپے

نصاب اردو

مرتب و ناشر : ادبی پبلشرز، شیفرڈ روڈ، بمبئی
صفحات : ۲۸۵
قیمت : ۳ روپے ۲۵ پیسے

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میرا صفحہ

دنیا کی کئی زبانیں ایک سے زائد ملکوں اور قومیتوں کے علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد یہی صورت اردو اور بنگالی زبانوں کی ہوئی۔ لیکن جب کہ مشرقی پاکستان تقسیم سے پہلے بھی بنگالی کا علاقہ مسلمہ طور پر تھا، مغربی پاکستان میں اردو کی حیثیت محض تعلیمی، تہذیبی اور اکتسابی تھی۔ اس حیثیت سے اس کا چلن مغربی پاکستان کے اس علاقے میں زیادہ تھا جو اب مغربی پنجاب کہلاتا ہے۔ سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اس کی حیثیت صرف ضمنی رہی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اردو بولنے والے مہاجرین کا ریلا زیادہ تر سندھ خاص طور پر شہر کراچی کی جانب رہا، جو ابتدائی مراحل میں پاکستان کا دار السلطنت بھی تھا۔ کراچی، جس کی آبادی تقسیم ملک سے قبل تین چار لاکھ کے درمیان تھی آناً فاناً تیس اور چالیس لاکھ کے درمیان کی آبادی کا شہر بن گیا۔ لسانی اعتبار سے اردو بولنے والوں کا جس قدر اجتماع اس شہر میں ہو گیا ہے اس کی نظیر ہند و پاکستان کے کسی علاقے میں نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد کراچی میں یہ لطیفہ عام تھا کہ جب کسی سیاح سے دریافت کیا گیا کہ وہ اس شہر میں کیا چیز دیکھنے کا خواہشمند ہے تو اس نے کہا "سندھی" کو! بلاشبہ اردو بولنے والے مہاجرین کی اس قدر بڑی تعداد میں آمد نے کراچی کی لسانی و تہذیبی نوعیت کو یک لخت بدل دیا۔ ان تہذیبی تبدیلیوں کی وجہ سے ثقافتی کشمکش اور آویزش کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ مسلم لیگ کے دوران قیادت میں اردو بولنے والے مہاجرین کا اثر سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے عام رہا۔ اس زمانے میں مولوی عبد الحق جیسے اردو کے پرستاروں نے یہ خواب تک دیکھا کہ مشرقی پاکستان میں اردو بھی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لی جائے۔ جب بنگالی قومیت کے سامنے ان لوگوں کی کچھ پیش نہ چلی تو پھر اس تجویز کی تائید حاصل کرنا چاہی کہ بنگالی کو کم از کم عربی حروف (جسے مصطفیٰ حروف القرآن کہا جاتا تھا) لکھنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن چند سال میں اس کا بھی پردہ فاش ہو گیا اور بنگالی، اردو کی ہمسری کی دعویدار بن کر پاکستان کی دوسری سرکاری زبان کے منصب پر فائز ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ بنگالی کو یہ سرخروئی بنگالی طلبہ کے خون کی بھینٹ نذر کرنے کے بعد حاصل ہوئی۔

مشرقی بنگال میں ناکامی کے بعد اردو قیادت کی ساری توجہ مغربی پاکستان پر مرکوز ہو گئی اور مغربی پاکستان کا ایک یونٹ بن جانے کے بعد رابطہ کی زبان کی حیثیت سے اردو کا موقف اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ یہ لسانی کثرت کے درمیان وحدت کا سر رشتہ بن گئی اور اس کا تمام تر مقابلہ اب انگریزی زبان سے رہ گیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دور آمریت میں اردو کی تعلیم کو عام کرنے کی ضمنی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ خاص طور پر علاقائی زبانوں کو سرنگوں رکھ کر اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے میدان خالی رکھا گیا۔ لیکن انگریزی کے اقتدار اعلیٰ کے سامنے اردو کو بھی سر جھکانا پڑا۔ ایک فوجی حکومت تہذیبی معاملات میں اس سے آگے سوچنے کی اہل بھی نہیں تھی۔

اس دوران میں اردو کی ترویج کو جس بات سے سب سے زیادہ دھکا لگا وہ دار السلطنت کا کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا جانا تھا۔ بظاہر اسلام آباد کا انتخاب سیاسی وجوہ کے پیش نظر کیا گیا تھا لیکن اس کے تہذیبی اور لسانی نتائج دور رس ثابت ہوئے۔ اب سیاسی قیادت مکمل طور پر پنجابیوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو کراچی میں اردو بولنے والے مہاجرین کے آئے دن کے سیاسی ہنگاموں سے تنگ آ گئے تھے۔

مغربی پاکستان کی زبانوں کے اعداد و شمار دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، لیکن معتبر روایت کے مطابق مغربی پاکستان میں اردو بولنے والوں کی مجموعی تعداد پندرہ فی صدی سے زیادہ نہیں، اور ان میں سے بیشتر اردو آبادی کا ارتکاز شہر کراچی میں ہے۔ اس اعتبار سے مغربی پاکستان میں اردو کا موقف ہندوستان کی ریاستوں، اتر پردیش، بہار اور آندھرا پردیش سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔

ابھی کچھ عرصہ قبل مغربی پاکستان کے ایک یونٹ کو توڑ کر اسے چار صوبوں (یا ریاستوں) میں پھر منقسم کر دیا گیا ہے۔ یہ تقسیم لسانی علاقوں کے اصول پر کی گئی ہے اور اس طرح سارا علاقہ چار زبانوں۔ پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچستانی میں تقسیم ہو گیا ہے۔ شہر کراچی کے سلسلے میں مختلف تجاویز سامنے آتی رہیں اور سیاسی دباؤ پڑتے رہے لیکن سندھ والوں کے اصرار پر بالآخر اسے ریاست سندھ ہی کا ایک شہر تسلیم کیا گیا ہے۔ مغربی پاکستان کی اس نئی ریاستی تنظیم سے اردو کی قسمت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مہر لگ جائے گی۔ ابھی تو فوجی حکومت چل رہی ہے لیکن بہت جلد عام انتخابات ہوں گے اور ریاستی سرکاریں وجود میں آ جائیں گی۔ علاقائی تقسیم کے نتیجے کے طور پر

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید افضل حسین ایم۔ اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

REGD. NO. L. 922　　فون نمبر ۲۹　　R. NO.　　2136/57